⊙ ڈاکٹر راشدہ قاضی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

⊙⊙ ڈاکٹر میمونہ سبحانی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

فیض اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے تحقیق وتنقید کے نئے مباحث کی ضرورت

Abstract:

The progressive literary movement offered freedom to changes of life and allowed scientific rationalism to flourish in literature. This movement made literature public and made it a representation of life and an adequate source for future development. People affiliated with this movement have raised their voices against hunger, social decline, poverty and slavery. Faiz Ahmad Faiz was the strong voice among the people associated with the progressive literary movement. Faiz put forward the slogan of revolution, which is why he faced difficulties in manila. After that, during the time of Zia ul Haq, Faiz Ahmad Faiz was presented as a figure of reconciliation against dictators. Sometimes due to polarization of views upon The Progressive Literary Movement, repetition of arguments and counterarguments cannot break the stagnant or monotonous atmosphere for indifferent reader of research journals. In this backdrop this joint paper seems an ice-breaker; seeking new avenues of research with a style of creative criticism.

Keywords:

Faiz, Poetry, Revolution, Progressive Movement, Literary

علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے شہر سیالکوٹ سے فیض احمد فیض اپنے داخلے کیلئے ۱۹۳۱ء میں علامہ ہی کا ایک تعارفی یا سفارشی خط لے کر گورنمنٹ کالج لاہور پہنچے تو اُنہیں اندازہ نہیں تھا کہ غالب اور اقبال کے بعد اُردو کے جن بڑے شاعروں کو پذیرائی اور شانِ محبوبیت ملنے والی ہے اُن میں وہ بھی شامل ہونگے۔ گورنمنٹ کالج لاہور [سال تاسیس

۱۸۶۱ء] پنجاب پر انگریزوں کی توجہ کا ایک دل آویز نقش بنا جس نے آزادی کے بعد بھی آزاد خیالی، فنونِ لطیف سے شغف اور عوام سے لگاؤ کے باوجود اشرافیہ کے احساسِ فخر کی علامت بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اورینٹل کالج لاہور [سال تاسیس ۱۸۷۰ء] یا پنجاب یونیورسٹی لاہور [سال تاسیس ۱۸۸۲ء] کی قدامت پسندی کے مقابلے پر گورنمنٹ کالج لاہور ہمیشہ نئے خیالات، تصورات اور تحریکوں کا خیر مقدم کرتا رہا۔ اس کی آبیاری میں جہاں ڈاکٹر لائٹنر [۱۸۴۰ء۔۱۸۸۹ء] جیسے مستشرق شامل تھے وہاں پروفیسر احمد شاہ بخاری [۱۸۵۸ء۔۱۸۹۸ء] گوروودت سوندھی [۱۸۹۰ء۔۱۹۶۶ء] صوفی تبسم [۱۸۹۸ء۔۱۹۷۸ء]، ڈاکٹر محمد اجمل [جی سی لاہور کے پرنسپل ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۲ء] کے ساتھ ڈاکٹر نذیر احمد [جی سی لاہور کے پرنسپل ۱۹۵۹ء۔۱۹۶۵ء] جیسے درویش منش لوگوں کا بھی کردار ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور اور امرتسر کو جڑواں ثقافتی شہر سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ فیض احمد فیض جب انگریزی کے لیکچرر کے طور پر ایم اے او کالج امرتسر سے ۱۹۳۵ء میں وابستہ ہوئے [۱۹۴۰ء تک وہاں رہے] بیشک یہ شہر ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ جیسے سانحے کو دیکھ چکا تھا، مگر یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ ابھی اس کے دامن میں فیض کے لئے کتنے طوفان پوشیدہ تھے۔ اسی کالج کے پرنسپل محمود الظفر (۱۹۰۸ء۔۱۹۵۴ء) اور اُن کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں (۱۹۰۵ء۔۱۹۵۳ء)، اور دِلّی کے دو دانشور اور ادیب احمد علی (۱۹۱۰ء۔۱۹۹۴ء) اور سجاد ظہیر (۱۹۰۵ء۔۱۹۷۳ء) کو مل کر دس افسانوں کا وہ مجموعہ [انگارے دسمبر ۱۹۳۲ء] چھاپنا تھا جو دو ماہ کی مدت کے اندر ضبط ہو کر ایک نئی تحریک کو متعارف کرا سکتا تھا، جسے اردو دنیا ترقی پسند ادبی تحریک کے طور پر جانتی ہے۔

اسی دور میں لندن کے نانکنگ ریستوران میں کمیونزم کی طرف جھکاؤ رکھنے والے دانشوروں کا اجتماع، ترقی پسند ادبی تحریک کا جو مینی فیسٹو تیار کر رہا تھا اُس کے مصنفوں میں مُلک راج آنند (۱۹۰۵ء۔۲۰۰۴ء) اور سجاد ظہیر کے ساتھ ڈاکٹر دین محمد تاثیر (۱۹۰۲ء۔۱۹۵۰ء) بھی تھے جنہیں اسی ایم اے او کالج امرتسر کا پرنسپل بننا تھا۔ ایک انگریز خاتون [کرسٹابل۔ بلقیس] سے شادی کرنی تھی اور اُسی خاتون کی دوسری بہن ایلس جارج [کلثوم] سے فیض احمد فیض کی محبت کی شادی ہونا تھی [شادی ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۱ء] (۱)۔ یوں اس کالج اور شہر سے فیض احمد فیض جیسا شرمیلا مگر رومانوی شاعر ایک دل پذیر ترقی پسند آواز کے طور پر ایسا اُبھرا کہ اپنے زمانے کی مقبول ترقی پسند آوازوں، اسرار الحق مجاز (۱۹۵۵ء۔۱۹۰۹ء)، مخدوم محی الدین (۱۹۰۸ء۔۱۹۶۹ء)، علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء)، معین احسن جذبی (۱۹۱۲ء۔۲۰۰۵ء) اور جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲ء) کا ہم نوا ہو کر بھی منفرد ہو گیا۔ اور اسی کالج کے قیام کے دوران فیض احمد فیض کو سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء۔۱۹۵۵ء) جیسا ایک شاگرد ملنا تھا جو شاید پڑھنے لکھنے میں تو سنجیدہ نہیں تھا مگر اُس کے فرانسیسی اور رُوسی ادب کے تراجم اور اپنے باغیانہ افسانوں [تماشا، نیا قانون] نے ایک دھوم مچا دینی تھی، مگر قیام پاکستان کے بعد ایک ایسا وقت آنا تھا کہ منٹو پر جب کبھی فحاشی کے الزام میں مقدمے چلنے تھے تو اُس نے اپنی صفائی میں سرفہرست اپنے اُس استاد کا نام لینا تھا جو فیض احمد فیض تھا، اگرچہ اس نے اپنی کلاس میں کبھی منٹو کو ایک شاگرد کے طور پر نہیں پایا تھا۔

یہی فیض، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور دیگر ترقی پسند رفقا کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام یا اسکی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے لئے سرگرم رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۵/اپریل ۱۹۳۲ء کو لکھنو میں پریم چند کی صدارت میں ہوئی تھی، مگر جیسے کہ پہلے ذکر ہوا کہ لندن کی ڈنمارک سٹریٹ میں واقع نانکنگ ریستوران میں نومبر ۱۹۳۵ء

میں ہندوستان کے چند آتش بجاں نوجوانوں (سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر) نے ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن Indian Progressive Writers Association بنائی، جس کے صدر ملک راج آنند منتخب ہوئے اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ ان نوجوان ادیبوں کو جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ہونے والی بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس برائے تحفظِ ثقافت World Congress of Writers for the Defence of Culture کے مقابل فکری کردار ادا کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

تاہم احمد علی (۱۹۱۰ء۔۱۹۹۲ء) نے ایک مضمون میں دعوی کیا 'جب صوبائی حکومت نے 'انگارے' کو زیر دفعہ نمبر ۲۹۵ (الف) تعزیراتِ ہند کے تحت ضبط کیا کہ یہ کتاب ایک خاص فرقے کے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کرتی ہے، تو محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا(۲)۔

اسی بات کو انہوں نے ایک آدھ جگہ دہرایا بھی ہے انگارے کی اشاعت اور ضبطی کے پانچ ماہ بعد ۵/اپریل ۱۹۳۳ء کو انگارے کے مصنفین نے دہلی سے پہلا منشور شائع کیا، جسے محمود الظفر نے تیار کیا تھا، جو اسی تاریخ کے 'لیڈر' میں شائع ہوا (جس کا عنوان تھا 'انگارے کے دفاع میں') اور اس کے آخر میں لکھا کہ: 'ہماری عملی تجویز یہ ہے کہ فوری طور پر ایک ''لیگ آف پراگریسو آتھرس'' قائم کی جائے، جو اس قسم کے مجموعے وقتاً وقتاً انگریزی اور ملک کی دوسری زبانوں میں شائع کرے، ہماری ان سب لوگوں سے درخواست ہے جو اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ وہ ہم سے رابطہ قائم کریں اور ایس۔احمد علی سے مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں'۔ ('افکار' کراچی: 'ترقی پسند تحریک کا پس منظر اور ن۔م۔راشد')

مگر حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی ہندوستان کے آتش فشاں میں لاوا پکنے کا عرصہ نہیں بلکہ آتش فشاں کے دہانے سے کثیف دھوئیں کے اخراج کا زمانہ ہے۔نوجوان خون پر اُس زنجیر کو کاٹ پھینکنے کا آرزو مند تھا، جو اسے غلام، مفلس اور مظلوم رکھنے پر مصر تھی، یہی صورت حال تھی، جب دسمبر ۱۹۳۲ء میں ادبی فضا میں ایک دھماکہ ہوا، 'انگارے' کے نام سے نو کہانیاں اور ایک ڈرامے پر مشتمل مجموعہ (نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، کرمیوں کی ایک رات، دلاری، پھر یہ ہنگامہ (سجاد ظہیر)، بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات (احمد علی) دلی کی سیر پردے کے پیچھے (ڈرامہ) (ڈاکٹر رشید جہاں) اور جواں مردی (محمود الظفر)، نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا جس کے خلاف رجعت پسندوں نے ہنگامہ برپا کر دیا، ایسے میں عبدالماجد دریا آبادی اور نیاز فتح پوری ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر 'انگارے' کے مصنفین پر سنگ زنی کرنے لگے، بعض اخبارات اور جرائد (سرگذشت، مدینہ، نظام، سرفراز) میں مخالفانہ مضامین لکھے اور لکھائے گئے، یو۔پی اسمبلی میں سوالات کیے گئے اور بالآخر اس کتاب کو ممنوع قرار دے دیا گیا جس کا باضابطہ اعلان ۲۵/مارچ ۱۹۳۳ء کے سرکاری گزٹ میں ہوا۔یہ عنوان معنی خیز ہے اور ساتھ ہی یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام 'آتش پارے'، چھبیل داس کے افسانوی مجموعے کا نام 'چنگاریاں'، سہیل عظیم آبادی کے افسانوی مجموعے کا عنوان 'الاؤ' اور احمد علی کے مجموعے کا نام 'شعلے' تھا، بہر طور احمد علی کے دعوے سے بھی سجاد ظہیر ہی کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔کیونکہ (الف) سجاد ظہیر ہی 'انگارے' کے مرتب اور پبلشر تھے اور وہ ان دنوں چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان میں آئے تھے۔(ب) سجاد ظہیر کے پانچ افسانے 'انگارے' میں شامل تھے۔(ج)

تنگ نظر لوگوں کو زیادہ تکلیف بھی سجاد ظہیر کے افسانوں نے پہنچائی تھی۔ سجاد ظہیر کی کتاب 'روشنائی' [مکتبہ دانیال کراچی] میں ان تمام کوششوں کی تفصیل موجود ہے، جو اس تحریک کے منشور پر برصغیر کی تمام اہم زبانوں کے قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں کے تائیدی دستخط حاصل کرنے کے سلسلے میں کی گئیں، سجاد ظہیر کو اپنے مشن میں توقعات سے بڑھ کر جو کامیابی حاصل ہوئی، اس کا بنیادی سبب برصغیر میں غلامی، افلاس اور جہالت کے خلاف وہ نفرت تھی، جو کم وبیش ہر ادیب و شاعر اور باشعور شخص کے سینے میں موجزن تھی۔ چنانچہ ۱۵/اپریل ۱۹۳۲ء میں ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کا حاصل ایک تو یہ اعلان نامہ تھا جس کا مسودہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا تھا:

> ''اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پسندی، جس کی موت لازمی اور یقینی ہے، اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست وریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھونڈتا رہا ہے، جس کے باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور مادہ پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے، ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پسند طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ جو اپنے ساتھ ادیب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں، ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے، جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے، اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے، ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے، یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں، ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں، ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں''۔ (۳)

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک بڑے شاعر کے طور پر متعارف ہونے سے پہلے فیض ایک رومانوی شاعر کے طور مقبولیت اختیار کر چکے تھے اور ان کے دو مختصر شعری مجموعے [نقش فریادی اور دست صبا] کی پذیرائی میں ان کی شاعری میں مغموم غنائیت اور ڈرامائی اجزا اپنا رنگ دکھا رہے تھے، پھر فیض احمد فیض دوسری جنگِ عظیم میں برطانوی فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے بھی وابستہ ہو گئے تھے [۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء] اور یوں نو آزاد ملک پاکستان کی فوج کے صفِ اول کے افسروں سے اُنہیں متعارف ہونا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ میاں افتخار الدین کے قائم کردہ پروگریسو پیپرز میں سے ایک پاکستان ٹائمز کے مدیر ہو گئے [۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء]۔ لیکن ۹/ مارچ ۱۹۵۱ء کو پنڈی سازش کیس کے حوالے سے ایک دھماکہ ہوا(۴) جس میں ان فوجی افسروں میجر جنرل اکبر خاں، میجر جنرل نذیر احمد، ائیر کموڈور محمد خان جنجوعہ، بریگیڈیئر محمد صدیق خان، بریگیڈیئر لطیف خاں، لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین، لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب، میجر اسحاق محمد، میجر حسن خان، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات کے ساتھ سید سجاد ظہیر [جو دو برس سے وارنٹ گرفتاری کے سبب روپوش تھے، میجر جنرل اکبر اور سجاد ظہیر کی خفیہ ملاقات فیض نے کرائی اور بعد میں گرفتار کیا گیا] (۵)، مسٹر محمد حسین عطا، بیگم نسیم اکبر خاں کے ساتھ فیض احمد فیض کی گرفتاری ایک عجیب واقعہ بن گئی۔ ۹/ مارچ ۱۹۵۱ء تا ۶/ اپریل ۱۹۵۵ء انہوں نے اسیری دیکھی، جس کے پہلے تین ماہ قیدِ تنہائی میں بسر ہوئے۔

ماجرا یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد روس امریکہ سرد جنگ میں زیادہ تر مسلمان ملکوں کو امریکہ نے ''نظریاتی مورچے'' پر ڈال دیا۔ اُن کی کمزور معیشتوں پر فوجی تربیت اور مدد کا بوجھ ڈالا اور اُنہیں پہلے معاہدہ ءعراق پھر سیٹو اور پھر سینٹو جیسے معاہدوں کا حصہ بنایا۔ بعض ملکوں کو نیٹو کا بھی رُکن بنایا یا نیٹو کے ایک ہمدرد اتحادی کا درجہ دیا۔ اس وجہ سے ان ملکوں کی فوج، بیوروکریسی، میڈیا اور درس گاہوں میں عام طور پر سوشلزم، کمیونزم یا بائیں بازو کے خیالات کو ایک گالی یا جرم بنا دیا اور اسی لئے تطہیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اسی تناظر میں ترقی پسند تحریک کے مخالفین کی طرف سے کہا جاتا رہا کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور پھر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ایماء پر ترقی پسند ادبی تحریک کو ہدایات ملتی رہیں یا پنڈی سازش کیس بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے زیرِ ہدایت برپا ہوا۔ اس سلسلے میں دونوں فریق اپنی انتہاؤں پر قائم رہے جو فیض احمد فیض کی صعوبتوں سے ہمدردی رکھتے تھے، کبھی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں تھے کہ پنڈی سازش کیس کی بنیاد، کسی شہادت یا یا شواہد پر تھی۔ دوسرے فیض احمد فیض اور اُن کے ساتھیوں کی صعوبتوں اور بعد میں ضیاء الحق دور کی بندشوں کے سبب ایک خاص طرح کا لگاؤ عقیدت کا رنگ اختیار کر گیا، کیونکہ ڈکٹیٹروں کے خلاف جمہوری تحریکوں میں عوامی ہمدردی کیلئے ضروری تھا کہ فیض احمد فیض کو ڈکٹیٹروں سے مفاہمت نہ کرنے والے ایک کردار کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس کے لئے عام طور پر ضیاء الحق کے ۱۱ برسوں میں فیض کی جلاوطنی کا ایک تاثر دیا گیا، وہ بلاشبہ خود ساختہ تھی مگر اس جلاوطنی کے دوران فیض نے بہت اعلیٰ شاعری کی، جیسے:

دِل من مسافرِ من
مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر

کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بَر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا! (لندن، ۱۹۷۸ء)

گویا انہیں پاکستانی ہیئتِ مقتدرہ کے خلاف مزاحمت کی ایک روشن مثال کے طور پر پیش کیا گیا، جنہوں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام جیل کی نذر کئے، اس عرصے میں انہیں غیر ملکی ایجنٹ، بھارت نواز، ملحد، بے عقیدہ بھی کہا گیا، مگر اس کے باوجود اپنی بچیوں کے لئے لاہور کی سڑکوں پر سائیکل چلاتی ان کی رفیقہ ایلس کے لئے احترام کے جذبات رکھنے والے بھی تھے اور ان کی معصوم بیٹیوں کو ان کے بابا کی متوقع پھانسی سے ڈرانے والوں کے مقابل دلاسہ دینے والے بھی کم نہ تھے۔[جیل سے ایلس کے نام فیض کے لکھے خطوط 'صلیبیں میرے دریچے کی' مطبوعہ دانیال کراچی میں یہ تفصیل دیکھی جا سکتی ہے]۔ یہی وہ پسِ منظر ہے کہ جنرل ضیاء الحق [دور اقتدار ۱۹۷۷ء۔۱۹۸۸ء] کے ساتھ فیض احمد فیض کے کسی رابطے کی سختی سے تردید کی گئی۔ مگر ڈاکٹر صلاح الدین حیدر جو خود مارچ ۱۹۸۱ء میں شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں رہے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''پھر اس دوران فیض پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاء الحق سے ملاقات کیلئے چلے گئے (بحوالہ مسز سرفراز اقبال، دامنِ یوسف، ص:۲۱۱)۔ جس کی تصدیق ڈاکٹر آفتاب احمد نے بھی کی جنہوں نے ۲ر جون ۱۹۸۷ء کو ایک انٹرویو میں بتایا ''فیض اپنے دوست اور پنڈی سازش کیس

کے زمانے کے اسیر، ساتھی کرنل ارباب نیاز کی وجہ سے ضیاء الحق کے ساتھ ملاقات کیلئے پہنچے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ پاکستان میں اُنہیں کام کرنے دیا جائے اور سی آئی ڈی کی نگرانی بند کی جائے''۔(۶)

پنڈی سازش کیس کی سزا کے بعد بھی وہ وقفے وقفے سے دو مرتبہ نظر بند ہوئے، سرکاری سطح پر مشکلات کا سامنا بھی رہا، مگر بیوروکریسی میں راوین کی کثیر تعداد پھر اشرافیہ خاص طور پر اس طبقے کی خواتین میں ان کی مقبولیت کے سبب وہ پاکستان کے ہر کرسی نشیں بلکہ سابق سے بھی مل سکتے تھے، اس سلسلے میں ڈاکٹر آفتاب احمد نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

''جب وہ اسلام آباد چھوڑ کر لاہور جانے والے تھے تو ایک دن صبح کے وقت فیلڈ مارشل ایوب خاں کے گھر پہنچ گئے۔ چوکیدار کو اپنا نام بتایا کہ اندر جا کر اطلاع کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایوب خاں ڈریسنگ گاؤں پہنے باہر نکلے اور ذرا حیرت سے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے؟ فیضنے بتایا کہ وہ اب لاہور میں منتقل ہو رہے ہیں محض خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔ ایوب خاں صاحب نے حال احوال پوچھا کافی منگوائی پھر دونوں میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور فیض نے اجازت چاہی۔ جب فیض نے مجھ سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو میں نے پوچھا کہ ان سے ملنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟۔ کہنے لگے میں اسلام آباد سے رخصت ہو رہا تھا سوچا کہ یہ شہر ان کا بسایا ہوا ہے چلو ان سے بھی رخصتی سلام کر لیں۔ ان کی شاید یہی ایک یادگار باقی رہ جائے گی۔''(۷)

'معتوب' ہونے کے باوجود اشرافیہ میں ان میں پذیرائی کے شاکی شاعرِ عوام حبیب جالب بھی رہتے تھے، ڈاکٹر آفتاب احمد نے ہی لکھا ہے:

''اُن کے ملنے والوں میں نواب مشتاق احمد گورمانی اور نواب مظفر علی قزلباش جیسے جاگیردار اور رؤسا بھی تھے۔ اس سلسلے میں ان کے بعض ہم صفیران پر اعتراض بھی کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حبیب جالب نے مجھ سے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا کہ فیض اسکاچ وہسکی ہیں اور میں چڑی مار کہ ٹھرا۔ میں نے فیض سے اس بات کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ کہتا تو ٹھیک ہے مگر ہم کیا کریں ہمارے وہ بھی دوست ہیں اور ہمیں جالب بھی عزیز ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ دوستی کی بنا پر گورمانی صاحب نے فیض سے ری پبلکن پارٹی کا مینی فیسٹو لکھوایا تھا اور ایس ایم شریف نے کہ جنرل ایوب خاں کے مارشل لاء کے زمانے میں وزارت تعلیم کے سیکرٹری تھے اپنی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ پر ان سے نظر ثانی بھی کرائی تھی۔ مختصر یہ کہ فیض اپنے سیاسی عقائد کے باوجود دوسری طرف کے لوگوں سے نفور نہیں تھے بلکہ بعض اوقات تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے دنیاوی رابطہ استوار رکھنا مفید اور ضروری سمجھتے تھے، انہیں کسی طبقے کے افراد سے میل ملاقات میں کوئی عار نہیں تھی۔''(۸)

مگر کم وسیلہ لوگ، مزدور انجمنوں کے لوگ، سیاسی ورکر اور وہ سب کو صبح انقلاب کا رومانوی خواب سنبھالے رکھتے ہیں، وہ

فیض کی ایسی نظموں کو ہر 'ممنوعہ اجتماع' میں والہانہ انداز میں گاتے، جھومتے اور رقص کرتے
آج بازار میں پابہ جولاں چلو۔۔

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں۔۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے

پھر لینن امن انعام ملنے اور ایفرو ایشیائی ادیبوں سے تال میل، عالمی تراجم اور پھر 'لوٹس' کی ادارت کے طفیل فیض کا ایک عالمی مقام بن گیا تھا، انقلابِ ایران پر انہوں نے جو ترانہ لکھا، آغا ناصر اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''۱۹۷۹ء کے موسم گرما میں میں نے ایک سینئر آرمی جنرل کے ساتھ جرمنی اور انگلستان کا سفر کیا۔ ابھی بھٹو صاحب کی پھانسی [۴/اپریل ۱۹۷۹] کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پاکستان اداس تھا۔ میں بھی اُداس تھا اور میں نے محسوس کیا میرے ہمسفر آرمی جنرل جو ضیاء الحق کی ''کچن کیبنٹ'' کے ممبر تھے وہ بھی اُداس تھے۔ سانحہ ہی کچھ ایسا تھا۔ جرمنی میں ہفتہ گزارنے کے بعد جب ہم لندن پہنچے تو مجھے معلوم ہوا کہ فیض صاحب لندن میں ہیں اور زہرہ نگاہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اپنے لندن قیام کے دران میں نے ایک شام اُن کے ساتھ گزاری۔ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا وہ بڑے ملول اور مضطرب ہیں۔ کھانے کے بعد جب لوگ جانے لگے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ٹھہر جاؤں۔ میں نے افتخار عارف کو بتایا جن کے ساتھ میں آیا تھا تو انہوں نے کہا آپ ٹھہریں، میں انتظار کرلوں گا۔ فیض صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور ڈیسک کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ جب انہوں نے یہ کام ختم کرلیا تو ایک کاغذ پر لکھی ہوئی دو نظمیں مجھے عنایت کیں اور کہا، ''پاکستان لے جاؤ، دوستوں میں تقسیم کر دینا۔ ان میں سے ایک نظم ہم نے ایران کے انقلاب پر لکھی ہے''۔ نظم کا عنوان تھا ''ویبقیٰ باسم ربک'' بعد میں انہوں نے اس کا عنوان تبدیل کر کے ''ویبقیٰ وجہ ربک'' کر دیا تھا۔ امام خمینی کی واپسی اور انقلابِ ایران کو ابھی چند ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ میں نے سوال کیا فیض صاحب! ایران کا انقلاب تو اسلامی انقلاب ہے۔ پھر آپ نے اس پر نظم کیوں لکھی۔ بولے، ''بھئی انقلاب اسلامی اور غیر اسلامی نہیں ہوا کرتے۔ جب لوگ تخت و تاج کو اُلٹنے اور بادشاہی کو تاراج کرنے کیلئے سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئیں تو پھر یہ عوامی انقلاب بن جاتا ہے۔''**(۸)**

بے شک اس نظم یا ترانہ کے ساتھ فیض نے اس کا زمانہ تخلیق جنوری ۱۹۷۹ء لکھا ہے، جو انقلاب ایران کی طرف بلیغ اشارہ ہے، ڈاکٹر تقی عابدی بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں:

''کافی وقت گزر جانے کے بعد فیض صاحب سے ایک شاعر صحافی مرحوم حسن رضا نے انٹرویو

کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ ''ایرانی انقلاب کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟''۔ فیض صاحب نے جواب دیا تھا ''یہ اپنی قسم کا بڑا انقلاب ہے اور فرنچ ریوولوشن کے بعد اس قسم کا انقلاب دنیا میں نہیں آیا۔ روس، چین، ویت نام وغیرہ کے انقلابوں میں طرفین کی فوجوں کے درمیان جنگ تھی، ایران میں براہ راست عوام کی، فوج اور حکومتی اداروں سے لڑائی ہوئی ہے، یہاں پر عوام نے فوج کو ہرایا ہے۔''(۱۰)

مگر مارچ ۱۹۸۱ء میں پی آئی اے کے ایک طیارے کی ہائی جیکنگ کے بعد پاکستان میں بائیں بازو کے اُستادوں، صحافیوں اور دانشوروں کو جس طرح پابندِ سلاسل کیا گیا، اس کے بعد فیض کا یہ ترانہ پاکستانی مزاحمت کا رزمیہ بھی بن گیا۔ اسی زمانے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ فیض احمد فیض کی لاہور میں سالگرہ کی تقریب منانے والے اُن کے داماد شعیب ہاشمی اور اداکار محمد علی تک کو بھی جیل میں بھیج دیا گیا اور جب پولیس افسر نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس پارٹی سے ہے تو شعیب ہاشمی جیسے حس مزاح رکھنے والے نے یہ جواب دیا 'برتھ ڈے پارٹی سے'۔ مگر اس خوش طبعی سے قطع نظر پاکستان میں مزدور انجمنوں، پیش قدم صحافیوں اور ترقی پسند دانشوروں نے فیض کی جلاوطنی میں ان کی سال گرہ کی تقریب کو ایک طرح سے مزاحمتی مورچہ بنا دیا۔ باغ جناح لاہور کی ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کی ایسی تقاریب میں اقبال بانو [۱۹۳۵ء۔۲۰۰۹ء] نے جب فیض کا یہ ترانہ پیش کیا تو ہزاروں کا مجمع بھی ساتھ رقص کرنے لگا:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی
اور اہل حکم کے سر اُوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے

سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خُدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو (جنوری ۱۹۷۹ء)

فیض احمد فیض چار سال ایک ماہ اور تقریباً گیارہ دن تک قید میں رہے اور ۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو قید سے رہا ہوئے۔ ایلس نے اپنی تصنیف 'ڈئیر ہارٹ ٹو فیض اِن پریژن'' کے اختتامیہ میں لکھا ہے کہ راولپنڈی سازش کیس سپیشل ٹریبونل بھی مولوی تمیز الدین کیس میں فیڈرل کورٹ کی رائے کے بعد مشتبہ ہوگیا۔ چنانچہ اس ذیل میں لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں جس بے جا کے خلاف ضمانت کی درخواست دی گئی اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فیض اب رہا ہو جائیں گے انہیں لینے کیلئے ایلس منٹگمری جیل کے دروازے پر پہنچیں تو انہیں آگاہ کیا گیا کہ فیض، میجر اسحاق اور خضر حیات ۱۹۴۴ء کے نظر بندی آرڈیننس کے تحت دوبارہ گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ چنانچہ واپس آکر وکیلوں کی معرفت اس آرڈیننس کے خلاف درخواست تیار کی جو جسٹس ایم آر کیانی (۱۹۰۲ء۔۱۹۶۲ء) کی عدالت میں پیش ہوئی اور یوں فیض تین مہینے بعد ضمانت پر رہا ہوئے یہاں تک کہ ہائیکورٹ کے فل بنچ نے راولپنڈی ایکٹ کو کالعدم قرار دے دیا(۱۱)۔

جب رخشندہ جلیل کی کتاب '' A Literary History of the Progressive Writers Movement in Urdu'' ۲۰۱۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس [بھارت] نے شائع کی اور اس میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی رُوداد وں کے حوالے سے واضح طور پر یہ لکھا گیا کہ سجاد ظہیر کو پاکستان میں ایک ایسی مسلح بغاوت میں موثر کردار ادا کرنے کی ہدایت کی گئی جو پنڈی سازش کیس پر منتج ہوا۔ اس پر پروفیسر فتح محمد ملک [جو حنیف رامے کے اسلامی سوشلزم کے قائل اور بھارت کے ساتھ اپنی نظریاتی مخاصمت کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں نے ایک کتاب لکھی 'انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان میں، [سنگ میل لاہور] جس نے ترقی پسندوں کے پرانے زخموں کو پھر سے چھیڑ دیا اور وہ جو کوشش کر کے پاکستانی عوام میں ایک مقدمہ لڑا گیا تھا اس بیانیے کے ساتھ کہ 'پنڈی سازش کیس امریکہ اور مغربی لابی یا فوج کے طالع آزما جرنیلوں کے ایماء پر بنایا گیا تھا'، اُس پر نئے سرے سے بحث شروع ہوئی۔ مگر تحقیق اور تنقید کی بنیاد دیانتِ فکر پر ہونی چاہیے جوشِ عقیدت پر نہیں۔ اس لئے اگر کسی تنظیم یا جماعت کے شواہد پر کوئی علمی بحث شروع ہوتی ہے تو اُس سے آنکھیں نہیں چرانی چاہئیں۔

۱۹۳۹ء میں جب فیض ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھا رہے تھے تو انہوں نے جدید اُردو شاعری (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۳۹ء) پر تحقیق کیلئے پنجاب یونیورسٹی کے متعلقہ حکام کو ایک خاکہ پیش کیا۔ تحقیق کیلئے درخواست کے ساتھ انہوں نے جو

خاکہ منسلک کیا، اس کے پندرہ ابواب تھے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض سلطنت مغلیہ کے زوال کے پس منظر میں اُردو شاعری کے علائم ورموز اور روایتی پیرایہء اظہار کا ایک تحقیقی جائزہ لینا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سماجی معاشرتی حالات کے پس منظر میں اُردو شاعری کے باغیانہ اسالیب کے مطالعے کا بھی عزم رکھتے تھے۔ تحقیقی کام کیلئے یونیورسٹی کے حکام سے فیض کی مراسلت کا سلسلہ چلتا رہا۔ فیض نے مجوزہ فارم پر بھی اپنی درخواست ارسال کی لیکن ان کے خاکے کے مطالعے کے بعد یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو یہ فیصلہ دیا کہ چونکہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے اس لئے انہیں اس ذیل میں یونیورسٹی کے اُردو لیکچرار سے تبادلہ خیال کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مزید پیش رفت کا سراغ نہیں ملتا۔ فیض صاحب کے اس خاکے کو ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے یونیورسٹی کے اس ریکارڈ سے نکالا جسے تلف کرنے کیلئے رکھا گیا تھا۔ انہوں نے خاکے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک موثر مقدمہ لکھا اور اُردو انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ہی جلد میں ''فیض احمد فیض جدید اُردو شاعری وخاکہ'' عنوان کے تحت بڑے سائز کی کتابی شکل میں شائع کرادیا(۱۲)۔

فیض احمد فیض ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں انگریزی کے استاد تھے فیض صاحب تعلیم وتحقیق کے میدان میں بڑھنے کے لیے انگلستان سے پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتے تھے مگر ۱۹۳۹ء کے جنگی (دوسری عالمی جنگ عظیم) حالات کی وجہ سے بحری راستے پرخطر ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ انگلستان نہ جا سکے اور ۱۹۳۹ء تا ۱۸۵۷ء ماڈرن اُردو پوئیٹری کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھنے کے لئے ایک درخواست ڈین آف یونیورسٹی انسٹرکشن، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے نام لکھی اور اس درخواست کے ساتھ فیض صاحب نے اپنے مقالہ کا مکمل تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا، مگر ہماری یونیورسٹیوں کی اندرون خانہ جنگی، بددیانتی اور کم مائیگی کے پیش نظر فیض کو یہ مقالہ لکھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس سلسلے میں ان کے بہت قریبی دوست عبدالروف ملک اپنی کتاب فیض شناسی میں لکھتے ہیں:

> ''اس مقالے کے سلسلے میں فیض اور یونیورسٹی کے کارپردازان کے مابین جو خط وکتابت ہوئی اس کی پوری فائل اتفاقاً ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاتھ لگ گئی جو انھوں نے راقم کو دکھائی بعدازاں پوری فائل کو زیروکس کروا کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔''(۱۳)

عبدالروف ملک نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب فیض احمد فیض، جدید اردو شاعری (۱۸۵۷ء۔۱۹۳۹ء) سے ڈاکٹر عبادت کی بات کو درج کیا ہے:۔

> ''افسوس ہے پنجاب یونیورسٹی کی قدامت پرستی، کم علمی اور نادانی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن شکر ہے کہ فیض صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا انگریزی خاکہ کسی غیبی مدد سے میرے ہاتھ آ گیا اور میں نے اس کو ایک اہم ادبی دستاویز سمجھ کے محفوظ کرنے کی کوشش کی اور کئی سال تک اس پر کام کیا، فیض احمد فیض، جدید اردو شاعری (۱۸۷۵ء۔۱۹۳۹ء) پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے کا خاکہ، دریافت، تحقیق، ترتیب ومقدمہ۔''(۱۴)

حوالہ جات

۱۔ سید تقی عابدی، فیض کا زندگی نامہ، مشمولہ: فیض شناسی، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۲۔۱۵

۲۔ تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف، مشمولہ: سیپ، (کراچی)، شمارہ ۴

۳۔ جریدہ گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر، (بمبئی)

۴۔ لدمیلا وسیلیوَ، پرورشِ لوح و قلم، (کراچی: آکسفورڈ پریس، ۲۰۰۷ء)، ترجمہ: اسامہ فاروقی، ص ۱۶۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۶۔ صلاح الدین حیدر، جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا: فیض احمد فیض شخصیت و فن، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۸۔۷۹

۷۔ فیض احمد فیض، شاعر اور شخص، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۴۸

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۹۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۹۸

۱۰۔ فیض شناسی، ص ۴۹۴

۱۱۔ جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا: فیض احمد فیض شخصیت و فن، ص ۷۰۔۷۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۷

۱۳۔ عبدالرؤف ملک، فیض ڈاکٹر فیض نہ بن سکے، مشمولہ: فیض شناسی، (کراچی: پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی)، ص ۱۳۱

۱۴۔ عبادت بریلوی، (لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۹ء)